نہیں جائے گا۔"

"نہیں۔"

"ہاں پہلے سے سوچ لے۔ ایک تو وہ لڑکی بہت شریف ہے اور پھر کرشن چندر کی بہن ہے۔ اس سے دغا کوئی اچھی بات نہیں ہوگی۔"

میں تو اسے منجدھار کے بیچ چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ چند ہی دنوں بعد وہ خود آیا اور رپورٹ دے کر چلا گیا۔ پھر کچھ دنوں تک کوئی خبر نہیں ملی کہ ذات گوت کا قضیہ کس مرحلہ میں ہے۔ مگر تھوڑے ہی دنوں بعد حلقہ ارباب ذوق میں ایک نئی شکل نمودار ہوئی۔ یہ ڈاکٹر عبادت بریلوی تھے جو دلی سے ہجرت کر کے لاہور آن پہنچے تھے۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو انہوں نے فوراً خبر سنائی "ارے ارے آپ انتظار حسین ہیں۔ آپ کے دوست ریوتی سرن شرما آپ کا ذکر کیا کرتے تھے۔ ارے بھئی ان کی شادی ہوگئی۔ بس ہم چند مسلمان دوست ہی ان کے براتی بن کر کرشن چندر کے گھر پہنچے تھے۔"

مگر پھر ہوا یوں کہ میں نے جب فساداتی ادب پر قلم اٹھایا تو یہ قلم سب سے بڑھ کر کرشن چندر کے خلاف رواں ہوا۔ غصہ یہ تھا کہ وہ افسانہ نگار جس کا میں کلمہ پڑھتا تھا "زندگی کے موڑ پر" اور "ان داتا" جیسے افسانے لکھنے کے بعد "پشاور ایکسپریس" ایسے افسانے کیوں لکھ رہا ہے۔ اور غیر جانبداری ظاہر کرنے کا یہ کونسا انداز ہے کہ ترازو لے کر بیٹھ گئے اور مظلومی اور شقاوت کو برابر برابر بانٹ کر دونوں اشیاء آدھی مسلمانوں کے پلڑے میں ڈال دیں اور آدھی ہندوؤں کے پلڑے میں۔ یہی بات اس مضمون میں لکھی گئی تھی جس کے لکھنے کی تقریب یہ تھی کہ "نقوش" کی آمد آمد تھی اور قاسمی صاحب کی طرف سے مجھے لکھنے کی دعوت ملی تھی۔ میری سادگی دیکھو کہ میں نے یہ سوچا ہی نہیں کہ میں کس رسالہ کے لیے کیا لکھ رہا ہوں۔ اور قاسمی صاحب کا ظرف دیکھو کہ انہوں نے ایک نو وارد لکھنے والے کا ایسا مضمون جو کسی طور ترقی پسند "نقوش" کی پالیسی سے ہم آہنگ نہیں تھا جوں کا توں چھاپ دیا۔ ادارے کی طرف سے صرف اتنا کہا گیا کہ ہاجرہ مسرور نے اس پر ایک صفحہ کا اختلافی نوٹ چڑھا دیا۔

احتشام صاحب کے خط کو بھی میں اسی فراخ دلانہ روئے کے تسلسل میں دیکھتا ہوں۔ تقسیم کے حوالے سے بحث کے سلسلہ میں احتشام صاحب نے کسی رسالے میں کچھ لکھا تھا۔ میرا قلم ان کے خلاف رواں ہوگیا۔ چند ہی دنوں بعد میں نے انہیں "نظام" کی طرف سے ایک خط لکھا۔ ادھر سے جواب آیا۔

بارودخانہ، لکھنو

20 جولائی 1948ء

محترمی تسلیم!

کئی دن ہوئے آپ کا خط ملا تھا کہ عید نمبر کے لیے کچھ لکھوں۔ میری خود خواہش تھی لیکن کچھ نہ لکھ سکا۔ ایک نظم ارسال خدمت ہے۔ اگر پسند آئے تو شائع کر دیجئے گا۔ موقعہ ملا تو پھر کچھ لکھوں گا۔

''نظام'' تو نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ مجھے صحیح طور پر اب تک اندازہ نہ ہو سکا کہ آپ اور عسکری صاحب اور آپ کے دوسرے ہم خیال کیا چاہتے ہیں۔ وہ کھل کر کچھ نہیں کہتے۔ عسکری صاحب تو اب کچھ صاف صاف کہنے لگے ہیں مگر ابھی تھوڑی سی جھنجھلاہٹ اور بڑھے گی تو وہ اور صاف باتیں کریں گے۔ جس راہ پر آپ لوگ چاہتے ہیں اس پر میں آپ کے ساتھ نہ چل سکوں گا۔ ادھر آپ حضرات نے میرے متعلق بہت کچھ لکھا۔ لیکن میں جواب الجواب کے طور پر کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ خیر اختلافات رکھنا برا نہیں بشرطیکہ ہم لوگ پر خلوص ہوں۔

''نظام'' کبھی ملتا ہے کبھی نہیں۔ آپ کے بعض آڈیٹوریل تو بہت تکلیف دہ تھے' لیکن بعض پسند آئے۔ آپ ترقی پسندی کو بھی تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو پھر میں نہ جانے کس کے حصے میں پڑوں گا' اور پڑوں گا بھی یا نہیں۔ آپ ملت کی حکومت چاہتے ہیں اور میری عقل حیران ہے۔ آپ حضرات کا جوش و خروش نو دولتوں اور مذہب بدلنے والوں کا سا ہے۔ یہ کارواں کہاں جائے گا۔

میں نے دو مختصر مضامین حال ہی میں لکھے ہیں۔ ایک ''نیا دور'' کراچی میں شائع ہو رہا ہے۔ دوسرا ''نقوش'' میں۔ میری خواہش ہے کہ آپ اور عسکری صاحب اس کے متعلق اپنے تاثرات سے مجھے آگاہ کریں۔ لیکن طعن و طنز کا نہیں' صحیح تنقید کا متمنی ہوں۔

یقین رکھئے کہ ہندوستان یا ہندوستان کے ادیب پاکستان کے دشمن نہیں ہیں۔ وہ کسی کے دشمن نہیں ہیں۔ لیکن پاکستان جس طرح بنا ہے اس کی وجہ سے آپ خود مشکوک ہیں اور پریشان۔ آپ کے یہاں خود یہ کانا کھٹکتا ہے کہ جو کچھ ہوا اچھا نہیں ہوا۔ لیکن آپ محب وطن اور وفادار بن کر نہ جانے کیا کیا کہہ رہے ہیں۔ مجھے احساس ہے کہ آپ اور عسکری صاحب دونوں خامکار اور پر جوش ہیں لیکن یاد رکھئے ابھی آپ ردعمل کے ایک شدید دور سے گزریں گے۔

حسن عسکری صاحب سے تسلیم کہئے گا۔ ناشر نے ''آخری سلام'' بھیج دیا ہے۔ پڑھ لوں تو اپنی رائے بھیج دوں گا۔ ابھی پڑھا نہیں۔ ترجمہ یقیناً اچھا ہی ہوگا۔ امید ہے کہ آپ لوگ اچھے ہوں گے۔

نیازمند۔۔۔۔۔۔۔احتشام حسین

''اختلافات رکھنا برا نہیں بشرطیکہ ہم لوگ پر خلوص ہوں۔'' احتشام صاحب نے کتنی اچھی اور سچی بات کہی۔ مگر ترقی پسند تحریک

اس رویے کو زیادہ دیر تک نباہ نہیں سکی۔ بہر حال جب تک تحریک نے اس رویے کو روا رکھا اس وقت تک ''ادب لطیف'' اور ''نقوش'' ایسے سچے پکے ترقی پسند رسالوں کو ہم ایسے رجعت پسندوں کی تحریروں کو چھاپنے میں کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا تھا۔ ادھر انجمن کے در بھی ہم پر کھلے تھے۔ عارف عبدالمتین کیا ہیرا آدمی تھے۔ امرتسر کی مٹی مگر رکھ رکھاؤ میں لکھنو سے بڑھ کر لکھنوی۔ انتہا پسند قسم کے انقلابی مگر نعرہ لگانے کی طاقت سے عاری۔ لہجہ اتنا دھیما مانو کانا پھوسی کر رہے ہیں۔ پھر یہ ہوا کہ انقلاب اپنی جگہ' دوستوں سے وضعداری اپنی جگہ۔ میرا ان سے نظریاتی اختلاف بھی چل رہا تھا اور دوستانہ تعلقات بھی چل رہے تھے۔ وقتاً فوقتاً مجھے محبت سے نوٹس دیتے ''انتظار صاحب! اگلے مہینے انجمن میں آپ کو افسانہ پڑھنا ہے۔'' اور میں خوشی خوشی انجمن میں جا کر اپنا نخالص رجعت پسندانہ افسانہ پڑھتا۔ بعد میں جو بھی حال ہوتا۔ مگر ایک شام انہوں نے کہا کہ آؤ چل کر کہیں بیٹھتے ہیں اور چائے پیتے ہیں۔ ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پی' پیار محبت کی باتیں کیں۔ دیر بعد جھجکتے جھجکتے بولے ''انتظار صاحب وہ جو میں نے انجمن کے لیے آپ کا افسانہ بک کیا تھا وہ پروگرام بدل گیا۔ میں آپ سے شرمندہ ہوں۔''

''کوئی بات نہیں عارف صاحب۔''

پھر رکتے رکتے بولے ''اور وہ جو ''جاوید'' کے لیے میں نے آپ سے افسانہ لیا تھا وہ بھی اب وہاں نہیں چھپ سکے گا۔ برا نہ مانئے گا۔ پارٹی کا فیصلہ ہے۔''

''کوئی مضائقہ نہیں۔''

پارٹی نے رجعت پسند ادیبوں کا حقہ پانی بند کر دیا تھا۔ باقاعدہ ناموں کا اعلان کیا گیا کہ فلاں فلاں ادیب ترقی پسند رسالوں میں نہیں چھپیں گے۔ مزید اعلان کیا گیا کہ سرکاری اور غیر سرکاری رجعت پسند رسالوں کا بائیکاٹ کیا جاتا ہے۔ کوئی ترقی پسند ان سے قلمی تعاون نہیں کرے گا۔

لیجئے ہم پر ترقی پسند رسالوں کے دروازے بند ہو گئے۔ ہر پھر کے وہی ''ساقی'' کہ شاہد صاحب اب لاہور سے کراچی جا چکے تھے اور وہاں سے ''ساقی'' نکلنا شروع ہو گیا تھا۔ یا پھر ممتاز شیریں کا ''نیا دور'' اور ہاں ''ماہ نو'' جس کی ادارت شروع میں پروفیسر سید وقار عظیم نے سنبھالی۔ پھر چند مہینے عسکری صاحب اس کے ایڈیٹر رہے۔ مگر پھر وہاں سے رسہ تڑا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ آخر رفیق خاور اس کے ایڈیٹر بنے جن کی ادارت لمبی چلی۔

خیر تو ذکر رجعت پسند ادیبوں اور ادبی رسالوں کے بائیکاٹ کا تھا۔ گرما گرمی میں یہ کام یاروں نے کر تو ڈالا۔ لیکن جب طبیعتیں

اعتدال پر آئیں تو پھر شاید سوچا کہ آخر اس فیصلہ میں کونسی دانشمندی تھی۔ یاد آیا کہ نظریاتی جنگ کے اس دور کے گزر جانے کے برسوں بعد روزنامہ ''مشرق'' میں اپنے کالم کی تقریب سے میں نے تحریک کے بعض بزرگ ادیبوں سے مختصر بات چیت کی تو منجملہ اور باتوں کے تحریک کے اس اقدام کے بارے میں بھی سوال کیا۔ سب نے یہی جواب دیا کہ یہ قرارداد بعض انتہا پسندوں کا کارنامہ تھی۔ ہم اس کے خلاف تھے' میں نے ایسی ہی ایک گفتگو میں سبط صاحب سے اس قرارداد کا ذکر کرتے ہوئے پوچھا کہ آپ کے باقی رفقا تو اس قرارداد سے بے تعلقی ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرارداد بعض انتہا پسندوں کی کارستانی تھی۔ آپ بتایئے کہ یہ انتہا پسند کون تھے۔

سبط صاحب نے بے تکلف کہا ''اس قرارداد کی پوری ذمہ داری میں قبول کرتا ہوں میں نے اسے مرتب کیا تھا مگر کسی نے اسی کی مخالفت نہیں کی تھی اور قاسمی صاحب تو اس زمانے میں انجمن کے جنرل سکیرٹری تھے۔ وہ کیسے بری الذمہ ہو سکتے ہیں۔ دیکھئے اس زمانے میں تو ہم شمشیر برہنہ تھے۔ انتہا پسند بنے ہوئے تھے اور انتہا پسندی نقصان تو پہنچاتی ہے۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ وہ کام ہم نے غلط کیا تھا۔ آخر ہم انسان تھے۔ فرشتے تو نہیں تھے۔''

کالم میں جس طرح جواب چھپا ہے میں نے یہاں اسے بعینہ نقل کر دیا ہے۔ سبط صاحب نے بات ذرا زیادہ وضاحت سے کی تھی جسے یہاں اختصار کر کے پیش کیا گیا تھا۔ مثلاً انتہا پسندی کی انہوں نے وجہ بھی بتائی تھی کہ اصل میں چین میں انقلاب آ جانے کے بعد ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ بس اب پاکستان میں بھی انقلاب آیا کہ آیا اور اس سے ہمارا دماغ پھر گیا۔

مگر کالم پڑھنے کے بعد سبط صاحب نے ایک وضاحتی خط لکھا۔ کیا مضائقہ ہے کہ اسے نقل کر دیا جائے۔

46 بلاک ای' بلاک 4
گلشن اقبال' کراچی
7 ستمبر 1982ء

برادرم انتظار حسین صاحب' سلام نیاز

آپ نے ''باتیں اور ملاقاتیں'' کے کالم میں یکم دسمبر 1981ء کو اس ناچیز کے بارے میں جو کلمات خیر لکھے تھے وہ میں نے پورے آٹھ ماہ بعد اب کے لاہور میں پڑھے۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ کے سے منفرد اور صاحب طرز ادیب کے قلم سے میرا ذکر زہے نصیب..... البتہ ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس میں 1949ء میں لاہور میں جو قرارداد منظور ہوئی تھی اس کی بابت شاید میں اپنا مافی الضمیر دوران گفتگو واضح نہیں کر سکا تھا۔ میں نے کانفرنس کا منشور لکھا تھا جو بعد میں غالباً ''سویرا'' میں شائع بھی ہوا تھا۔ یہ منشور

''انتہا پسندی'' کا شاہکار تھا اور ساری خرابی اور بدمزگی اسی منشور سے پیدا ہوئی۔ قرارداد بھی اسی کا شاخسانہ تھی۔ یہ قرارداد ڈیلی گیٹوں کے پرائیوٹ اجلاس میں اتفاق رائے سے منظور ہوئی تھی۔ ڈیلی گیٹوں کا یہ اجلاس کانفرنس سے ایک دن پہلے جناب مظہر علی خاں کے فلیٹ واقع نکولسن روڈ پر رات کے وقت منعقد ہوا تھا۔ اب یہ تو یاد نہیں کہ قرارداد لکھی کس نے تھی۔ مگر جس نے بھی لکھی تھی اجلاس کے دوران سب کے مشورے اور منشا سے لکھی تھی۔ لہٰذا اس سے میرے یا کسی دوسرے شریک محفل کے قرارداد سے بری الذمہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

آپ مجھ سے ہلٹن میں ٹھہرنے کا طعنہ دیتے ہیں۔ یقین مانئے مجھ کو جدید طرز کے سب ہوٹلوں سے دلی نفرت ہے۔ ان میں یوں محسوس ہوتا ہے گویا کابک یا ڈربے میں بند ہو گئے ہیں۔ زندہ درگور کی اصطلاح شاید انہیں کمروں کے لیے وضع ہوئی تھی' مگر مجبوراً ٹھہرنا پڑتا ہے۔ جب سے شاکر علی ہم سے بچھڑے ہیں لاہور میرے لیے پرایا دیس بن گیا ہے۔ شاکر کی زندگی میں تو میں کبھی ہوٹلوں میں نہ ٹھہرا۔ ائیر پورٹ یا ریلوے سٹیشن سے سیدھا ان کے گھر چلا جاتا تھا۔ اور بے تکلفی سے جب تک جی چاہتا رہتا تھا۔ وہ تو یہ بھی نہیں پوچھتے تھے کہ کیوں آئے اور کب جاؤ گے۔ اب آپ ہی بتایئے لاہور میں کوئی ایسا یار' کوئی ایسا گھر ہے جہاں جا کر ٹھہروں۔ لاہور میرے لیے شاکر کے دم سے اپنا شہر تھا۔ وہ نہیں رہا تو ہوٹل میں نہ ٹھہروں تو کہاں جاؤں۔ میکدے ویران ہیں اور مسجدیں اور خانقاہیں مجھ کو قبول نہیں کریں گی۔

نیازمند۔۔۔۔۔۔۔سبط حسن

اور اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ اس واقعہ کے بعد بھی تو میں نے ایک دفعہ انجمن کی نشست میں اپنا افسانہ سنایا تھا۔ مگر اب تو زمانہ ہی بدل چکا تھا۔ پنڈی سازش کیس کے سانحہ نے ترقی پسند تحریک کو ایسا دھچکا لگایا کہ ساری محفل ہی درہم و برہم ہو گئی۔ فیض صاحب تو خیر سید سجاد ظہیر کے ساتھ بڑے ملزموں کی صف میں شامل تھے۔ جب وہ واپس آئے تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ جیسے تیسے کر کے انجمن کو پھر سے آراستہ کیا گیا۔ بائیکاٹ کی قرارداد تو تحریک کے عروج کے زمانے کی یادگار تھی۔ اب ان تلوں میں اتنا تیل کہاں تھا کہ اس قرارداد کو برقرار رکھا جاتا۔ سو وہ فراموش ہوئی۔ حمید اختر نے مجھے افسانہ پڑھنے کی دعوت دی۔ میں نے انجمن کے اچھے زمانوں میں اس کے جلسوں میں اپنی شرکت کو یاد کیا اور فوراً تیار ہو گیا۔ اپنا افسانہ ''ٹھنڈی آگ'' بغل میں داب جلسہ میں پہنچا۔ مگر اب وہ سماں کہاں۔ نہ وہ یاروں کی ریل پیل' نہ وہ گرما گرمی' وہ جوش و خروش' نقی بلڈنگ میں اجڑا اجڑا ایک کمرہ۔ داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی اکا دکا شمع۔ یکمشت حاضرین۔ پھر بھی میرے لیے وہ نشست یادگار ہے کہ میں نے اپنا ایک بہتر افسانہ وہاں پڑھا اور باجرہ مسرور سے میرا

وہاں تعارف ہوا۔ پہلے وہ کہاں نظر آتی تھیں۔ پردے میں رہتی تھیں۔

اب جلسہ میں ہونے والی تنقید میں بھی وہ جوش وخروش نہیں تھا۔ میں نے ان یکمشت حاضرین سے اپنے افسانے کی داد پائی۔ دل نے کہا اس اجڑی صحبت کو غنیمت جانو۔ کل کیا خبر ہے کہ یہ بھی رہے رہے نہ رہے۔ تحریکیں کس شور سے اٹھتی ہیں اور کس طرح اچانک ڈھے جاتی ہیں۔ رہے نام اللہ کا۔

◆◆◆

چند روز ''امروز'' میں

تھوڑا سا اپنی ذات کے متعلق بھی سہی۔ کم از کم یہ تو بتا ہی دینا چاہیے کہ یہ رجعت پسند ''نظام'' سے نکل کر ''امروز'' میں کیسے آ گیا جو ترقی پسندی کی اقدار کا ترجمان تھا اور جس کا پاکستان کمیونسٹ پارٹی سے رشتہ استوار تھا۔ اور ہاں یہ بھی کہ رہائش بھی اب تبدیل ہو چکی تھی۔ ''نظام'' سے تو میں 1949ء کے بیچ نکلا۔ عسکری صاحب سے مفارقت 1948ء کے بیچ ہی ہوگئی تھی۔ وجہ یہ کہ ہمارے خاندان کی ایک اور قسط یہاں آن پہنچی تھی۔ میرے دو بھانجے انصار حسین اور حسن ظہیری یوپی سے آنے والوں کا طریقہ واردات کچھ اس طرح کا تھا کہ جیسے کسی پرانی عمارت کی ایک اینٹ نکل جائے بس پھر اینٹیں نکلتی چلی جاتی ہیں اور یوں عمارت دھیرے دھیرے کر کے ٹوٹتی بکھرتی ہے۔ خاندان سے کسی ایک فرد کے نکلنے کی دیر ہوتی تھی۔ پھر جیسے خاندان کی تاب مقاومت ختم ہوگئی ہو۔ پھر ایک ایک کر کے نکلنا شروع ہو جاتے۔ خیر تو میں نے اپنی اولین پناہ گیروں کی بستی کرشن نگر کو سلام کیا اور انصار منوں کے ساتھ فیروز پور روڈ پر ایک کوٹھی کے حصہ میں جو کہ کرائے پر لیا گیا تھا پڑاؤ کیا۔ پھر جب یہ خاندان پھیلنا شروع ہوا تو اس مختصر حصے کو چھوڑ کر برابر ہی میں ایک کوٹھی معمولی کرائے پر لی گئی۔ کرائے ان دنوں ایسے کونسے زیادہ تھے۔ سامنے سڑک کے اس پار کی کوٹھی سے کبھی کبھی ایک مانوس چہرہ نمودار ہوتا۔ سورن لتا کا چہرہ۔ یہ نذیر اور سورن لتا کی کوٹھی تھی۔ رفتہ رفتہ پتہ چلا کہ یہاں تو اردگرد دائیں بائیں ایسی ہی صورتیں آباد ہیں۔ چند قدم کے فاصلہ پر مسلم ٹاؤن میں پنچولی سٹوڈیو جو تھا۔ عقب میں دیوار سے جھانک کر دیکھا تو دور تک کھیت پھیلے نظر آئے مگر ان کھیتوں کے اب دن گنے گئے تھے۔ یہاں تو نئی نئی بستیاں آباد ہونی تھیں' رحمن پورہ' وحدت کالونی' مسلم ٹاؤن' نیو مسلم ٹاؤن' اقبال ٹاؤن' یونیورسٹی نیو کیمپس وغیرہ وغیرہ۔

''امروز'' کی صورت یہ تھی کہ یہ اخبار نیا نیا پروگریسو پیپرز کے اہتمام میں نکلنا شروع ہوا تھا۔ فیض اور مولانا چراغ حسن حسرت اس کے ایڈیٹر تھے۔ مگر فیض صاحب کا تو نام ہی نام تھا۔ انہیں ''پاکستان ٹائمز'' کی ادارت ہی بہت تھی۔ ''امروز'' پر تو بس ان کے نام کا سایہ تھا۔ عملاً حسرت صاحب اکیلے اس کے ایڈیٹر تھے۔ اور کیا خوب ایڈیٹر تھے۔ اس کی شکل مروجہ اردو اخباروں سے بالکل مختلف تھی کہ اردو اخبار تو گیٹ اپ نام کی چیز سے آشنا ہی نہیں تھا۔ صفحات پر خبریں گھچ پچ۔ کوئی ترتیب' نہ سرخیوں میں کوئی قرینہ۔ اس اخبار نے گیٹ اپ پر خاص زور دیا۔ خبروں اور فیچروں کی پیشکش میں ایک ترتیب ایک قرینہ پیدا کیا۔ پھر سٹاف کی تنخواہوں میں بھی ایک

باقاعدگی پیدا کی۔ گریڈ مقرر ہوئے۔ سالانہ ترقی اور پنشن کا ڈول ڈالا گیا۔ اردو اخباروں میں یہ کہاں ہوتا تھا۔ ادبی ضمیمہ قسمت علمی و ادبی کے عنوان سے اس شان سے نکلا کہ اس کا اپنا ایک معیار ہوتا تھا۔ نامور لکھنے والوں کا تعاون حاصل کیا گیا اور معاوضے ادا کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ غزل کا معاوضہ دس روپے مقرر ہوا۔ مضمون سات روپے کالم کے حساب سے۔ بالعموم تین کالموں کے مضمون کی فرمائش کی جاتی تھی۔ معاوضہ اکیس روپے۔ اس زمانے میں لاہور میں فلیکس کے ربڑ سول جوتے کا فیشن چل رہا تھا۔ یہ جوتا اکیس روپے کا آتا تھا۔ ادیبوں کے لیے اس جوتے کی قیمت تھی ''امروز'' کے تین کالم۔ گویا ''امروز'' میں مضمون لکھنے کا مطلب تھا فلیکس کا ایک جوڑی جوتا۔ اس اخبار کے طفیل شہر کے کتنے ادیب فلیکس کا جوتا پہن کر جنٹلمین بن گئے۔

اردو اخباروں میں آگے تو ملازمت ملنے کی بس اتنی شرط ہوتی تھی کہ آپ اردو میں اتنی شد بد رکھتے ہیں کہ لکھ لکھا سکیں۔ خبروں کا جیسا کیسا ترجمہ کر سکیں۔ یہاں باقاعدہ تعلیم یافتہ مطلب یہ کہ ڈگری یافتہ ہونے کی شرط رکھی گئی اور ملازم رکھتے وقت سختی سے اس شرط کو ملحوظ رکھا گیا۔ چونکہ لیفٹ کا اخبار تھا اس لیے توقع ہی کی جاتی تھی کہ اس نظریے والوں کو ترجیح دی جائے گی۔ سو ایسے بزرگ اور نوجوان ''امروز'' میں ملازمت کی طلب میں سیدھے میاں افتخار الدین کے پاس پہنچتے۔ وہ انہیں حسرت صاحب کی طرف منتقل کر دیتے۔ حسرت صاحب اپنے رنگ سے ان کی لیاقت کو جانچتے پرکھتے۔ پھر سگریٹ کا لمبا کش لے کر کہتے ''مولانا ہم نے اخبار نکالا ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کا دفتر نہیں کھولا۔'' اور ملازمت کے امیدوار کو چٹخا دیتے۔ سو اس اخبار میں کامریڈ خال خال اور تعلیم یافتہ نوجوان زیادہ نظر آتے تھے۔

مگر حسرت صاحب پروفیسر ممتاز حسین کو تو اس طرح نہیں چٹخا سکتے تھے۔ خالی ڈگری والے تعلیم یافتہ نہیں۔ وہ تو فاضل نقاد تھے اور علم کا سرخ سمندر مگر انہوں نے ''امروز'' میں آتے ہی ایک بحران پیدا کر دیا۔ اس وقت کے امریکی وزیر خارجہ ڈلس کا کوئی بیان آیا جو اپنی سیاسی اہمیت کی وجہ سے اگلے دن اخباروں کی لیڈ بنا۔ مگر جب حسرت صاحب نے ''امروز'' پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ یہ بیان غائب ہے۔ سر پیٹ لیا اور دفتر سر پہ اٹھا لیا۔

سوئے اتفاق سے اس رات نیوز ایڈیٹر ابرار صدیقی چھٹی پر تھے۔ کوئی دوسرا ہی ان کی جگہ شفٹ انچارج تھا۔ کاپی جوڑتے وقت اسے دھیان ہی نہیں آیا کہ ڈلس کا بھی ایک بیان آیا تھا وہ کہاں ہے۔ اب جو اس سے پوچھ گچھ کی گئی تو اسے یاد آیا کہ ایسا بیان آیا تو تھا۔ اور وہ اس نے ممتاز صاحب کو ترجمہ کے لیے دیا تھا۔

ممتاز صاحب سے پوچھا گیا ''ممتاز صاحب ڈلس کا بیان آپ کے پاس ترجمہ کے لیے آیا تھا۔''

''جی میرے ہی پاس ترجمہ کے لیے آیا تھا۔''

''پھر آپ نے اس کا کیا کیا۔''

''کیا کرتا۔ بے معنی بیان تھا۔ وہی سامراجیوں کے استحصالی ہتھکنڈے۔ میں نے پھاڑ کے پھینک دیا۔''

ممتاز صاحب تو ''امروز'' کو اپنے نظریئے کا ترجمان سمجھ کر آئے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ یہاں بھی رجعت پسندی کا کھٹراک پھیلا ہوا ہے تو اکھڑ لیے۔ پھر یہ خاک بھی اڑ کر اسی شہر میں پہنچی جہاں گنگا جمنا کا پانی بہہ کر پہنچ رہا تھا اور اکٹھا ہوتا چلا جا رہا تھا۔

ویسے بھی ممتاز صاحب کی حسرت صاحب سے کہاں نبھ سکتی تھی۔ ایک جنگل میں دو شیر تو نہیں رہ سکتے۔ حسرت صاحب کی بلا سے کہ کسی کامریڈ نے مارکس اور اینگلز کا کتنا مطالعہ کیا ہے۔ وہ تو زید بکر سب کو ایک ہی سوال سے آزماتے تھے ''مولانا آپ نے طلسم ہوش ربا پڑھی ہے۔'' اسی سوال کے جواب پر آدمی پاس فیل ہوتا تھا۔ خیر پاس کی بات تو جانے ہی دیں۔ مولانا ''امروز'' کے دفتر میں ابوالہول بنے بیٹھے رہتے تھے۔ سوال کا جواب جس نے ناں میں دیا وہ بھی مارا گیا جس نے ہاں میں دیا وہ بھی سرخرو ہوتے نہیں دیکھا گیا۔

مولانا کیا خوب بزرگ تھے۔ لمبے ٹونگے' بھاری بھرکم۔ اسی تناسب سے آواز بھاری کش لیتے اور ہر ادنیٰ اعلیٰ سے ایک ہی انداز سے مخاطب ہوتے ''مولانا..... '' فقرہ باز غضب کے۔ آدمی رعب داب والے تھے۔ دفتر میں دفتر سے باہر سب ان سے رعب کھاتے تھے۔ سوائے ان کے چپراسی کے۔ اس کا نام تھا رمضان۔ بدن چمرخ' بال کھچڑی۔ چہرہ پچکا ہوا۔ مگر آنکھوں کی چمک قائم تھی۔ حسرت صاحب کے کمرے کے باہر تپائی پہ بیٹھا رہتا۔ کوئی سیدھا سادہ اجنبی ان سے ملنے آ جاتا تو بڑی بڑی آنکھیں نکال کر اسے دیکھتا اور کہتا ''صاحب کام کر رہے ہیں۔ نام لکھ دو اپنا۔''

مگر اس طرح رعب گانٹھنے کے موقعے کم آتے۔ یار لوگ بالعموم اسے خاطر میں لائے بغیر چق اٹھاتے اور اندر داخل ہو جاتے۔ آنے والوں کی یہ بے تکلفی دیکھ کر رمضان کو حسرت صاحب پہ غصہ آتا۔ پھر وہ تقسیم سے پہلے کے اس زمانے کو یاد کرتا جب وہ ایک سکھ وزیر کا اردلی تھا اور کسی کی مجال نہیں تھی کہ اسے نظر انداز کر کے اس کی اجازت کے بغیر اندر داخل ہو جاتا۔ سکھ وزیر کے اردلی کی حیثیت سے وہ کتنا معزز تھا۔ حسرت صاحب کی اردل میں اس کی کتنی بے توقیری ہو رہی تھی۔

حسرت صاحب کے کمرے میں آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ صحافی' ادیب' ناشر' کتب فروش' کاغذوں کے تاجر' عرب ہوٹل کا

کوئی بچا کچھا ہمنشین شرابی کبابی تماشبین شاعر شطرنج باز گانے بجانے کے رسیا شعر و شاعری کے شوقین کوئی خوش شکل نوخیز صحافی غرض عجب کھچڑی محفل ہوتی۔ ادھر باہر رمضان تپائی پہ بیٹھا حسرت صاحب کی بے رخی اور اپنی بے توقیری پر کڑھتے کڑھتے اپنے پرانے سکھ آقا کے وقار اور طنطنہ کی یادوں میں کھو جاتا ادھر اندر بیٹھے حسرت صاحب کو ''الہلال'' کے دن یاد آ جاتے۔ پھر زقند لگاتے اور حالی و سرسید کے زمانے میں پہنچ جاتے۔ وہاں سے زقند بھری اور غالب کی دلی میں۔ غالب کی دلی سے نکلے اور ایران پہنچ جاتے۔ ناصر الدین قاچار قا آنی حافظ سعدی ایران سے ملایا میں۔ ملایا سے کلکتہ میں۔

''مولانا، آپ نے کلکتہ دیکھا ہے۔''

''نہیں مولانا۔''

''پھر مولانا آپ نے کیا دیکھا ہے۔'' سگریٹ کا ایک لمبا کش اور کلکتہ کا قصیدہ شروع ''مولانا'' کلکتہ بہت بڑا شہر ہے۔''

''مولانا آپ نے طلسم ہوش ربا پڑھی ہے۔''

''نہیں مولانا۔''

''پھر مولانا آپ نے کیا پڑھا ہے۔'' سگریٹ کا لمبا کش لیا آنکھیں بند کیں۔ شروع ہو گئے سرسید شبلی حالی ذکاء اللہ محسن الملک مولوی چراغ علی محمد حسین آزاد نصیر حسین خیال کیسی کیسی شخصیت گزر گئی۔ اب کون باقی رہ گیا ہے۔ لے دے کے ہمارے عبدالمجید بھٹی جو کتاب اس ڈر سے نہیں پڑھتے کہ کہیں ان کی اوریجنلٹی نہ ماری جائے۔'' پھر سگریٹ کا کش اور لمبا ٹھنڈا سانس ''صاحب یہ آج کل کے ادیب ہیں۔ ان میں سے کسی نے طلسم ہوش ربا نہیں پڑھی ہے۔''

جس نے ''طلسم ہوش ربا'' نہیں پڑھی تھی وہ تو گردن زدنی تھا ہی مگر جس نے ''طلسم ہوش ربا'' پڑھنے کا اقرار کیا وہ بھی خطاوار ٹھہرا۔ حسرت صاحب یہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ کوئی ایرا غیرا نتھو خیرا ''طلسم ہوش ربا'' پڑھ کر ان کے برابر آ جائے۔ پھر کوئی اس وجہ سے نظروں سے گرا کہ اس نے ''فسانہ آزاد'' نہیں پڑھا تھا اور کوئی اس باعث معتوب ٹھہرا کہ اس نے ''فسانہ آزاد'' پڑھ لیا تھا۔

میاں افتخار الدین کا وزارت سے علیحدہ ہونا اور ''امروز'' کا جاری ہونا۔ یہ دو واقعات آگے پیچھے ہوئے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد چین میں انقلاب آ گیا۔ چیانگ کائی شک اقتدار سے باہر ہو گئے۔ میاں صاحب حسرت سے مخاطب ہوئے ''حسرت صاحب اب چیانگ کائی شک کیا کرے گا۔''

مولانا نے سگریٹ کا لمبا کش لیا اور بولے ''مولانا' وہ بھی کوئی اخبار نکال لے گا۔''

وہ اپنے زمانے کے ادیبوں سے جتنے بیزار تھے اتنا ہی اپنے زمانے کے سیاست دانوں سے متنفر تھے۔ ادیبوں کو جاہل سمجھتے تھے کہ انہوں نے ''طلسم ہوش ربا'' نہیں پڑھی تھی۔ سیاست دانوں کو کور ذوق جانتے تھے کہ وہ ان کے فقرے کی صحیح داد دینے سے قاصر تھے۔ زمانے کی بے ذوقی کا ماتم کرتے۔ پھر انہیں سر سکندر حیات خاں یاد آ جاتے کہ ان پر پھبتی کہی جاتی تو وہ دوسرے دن داد بھیجتے اور دوستوں میں تقسیم کرنے کے لیے اخبار کا ایک پورا بنڈل منگواتے ''اور آج کل کے یہ لیڈر'' مولانا ٹھنڈا سانس بھرتے ''فقرے پر داد کیا دیں گے۔ فقرہ سمجھتے ہی نہیں۔ اور ہمارے میاں افتخار الدین۔ مولانا' میری تو اس اخبار میں نوکری اس وجہ سے لگی ہوئی ہے کہ میاں صاحب کے ڈرائیور کو میرا کالم پسند ہے۔''

زبان و بیاں پر بہت زور دیتے تھے۔ ''امروز'' میں ہونے والی غلطیوں سے صرف نظر کیا جا سکتا تھا۔ مگر زبان کی غلطی معاف نہیں ہو سکتی تھی۔

ایک صبح میں دفتر میں داخل ہوا دیکھا کہ دفتر میں کھلبلی پڑی ہوئی ہے۔ پتہ چلا کہ آج کے اخبار میں زبان کی ایک غلطی ہو گئی ہے۔ حسرت صاحب سخت غصے میں ہیں۔ نذیر خواجہ کو انہوں نے معطل کر دیا ہے۔ ویسے تو نیوز ایڈیٹر اب حمید ہاشمی تھا۔ مگر رات وہ نہیں آیا تھا۔ اس کی قائم مقامی نذیر خواجہ کر رہے تھے۔ حمید ہاشمی نے مجھے دیکھا تو فوراً مجھے پکڑا اور الگ کونے میں لے گیا ''تمہیں پتہ ہے حسرت صاحب نے خواجہ کو معطل کر دیا ہے۔''

''ہاں ابھی پتہ چلا ہے۔''

''اس کے ذمہ دار تم ہو۔''

''میں؟''

''ہاں خواجہ کہتا ہے کہ اس خبر کی سرخی جس پر حسرت صاحب کو اعتراض ہے وہ تم نے بنائی تھی۔''

پھر اس نے وہ خبر اور اس کی سرخی مجھے دکھائی۔ میں نے سرخی پڑھی اور اقرار کیا کہ ''ہاں یار یہ سرخی میں نے ہی بنائی تھی اور حسرت صاحب کا اعتراض بھی درست ہے۔ مجھ سے گھپلا ہو گیا۔''

''پھر تم جاؤ اور حسرت صاحب کو بتاؤ کہ یہ غلطی تم سے ہوئی ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ وہ تم سے زیادہ کچھ نہیں کہیں گے۔ مگر خواجہ کو وہ نہیں چھوڑیں گے۔''

میں سیدھا حسرت صاحب کے کمرے میں پہنچا۔

''کہیے مولانا' کیسے آنا ہوا۔''

عملہ کی آئے دن اس کمرے میں پیشیاں ہوتی تھیں۔ان کی بھی جو معتوب تھے اور جنہیں مولانا نالائق جانتے تھے۔اور ان کی بھی جو ان کے محبوب تھے اور جن کی غلطیاں نکالنا اور انہیں کچوکے دینا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔میں نہ معتوبوں میں تھا نہ محبوبوں میں۔ اس لیے میری پیشی کی کبھی نوبت ہی نہیں آئی۔آج میں خود ہی زبان کا مجرم بن کر پیش ہو گیا تھا۔

''مولانا بات یہ ہے کہ زبان کی جس غلطی کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے اس میں نذیر خواجہ کا کوئی قصور نہیں ہے۔وہ خبر اصل میں میں نے بنائی تھی۔تو اس کی سزا مجھے ملنی چاہیے۔''

حسرت صاحب نے غصے سے مجھے دیکھا''مولانا' آپ خواجہ کو بچانے کے لیے یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔''

''نہیں' میں صحیح عرض کر رہا ہوں۔''

حسرت صاحب نے کچھ سوچا۔پھر اخبار میری طرف بڑھایا''کیا خیال ہے یہ زبان درست ہے۔''

''نہیں' غلطی بس ہو ہی گئی۔''

حسرت صاحب نے لمبا کش لیا''مولانا' آپ سے تو زبان کی غلطی نہیں ہونی چاہیے۔''

پھر بولے''اچھا ہاشمی صاحب کو میرے پاس بھیجئے۔''

میں نے حمید ہاشمی کو جا کر نوید دی۔لیجئے نذیر خواجہ کی جاں بخشی ہو گئی۔ورنہ زبان کی ایک چھوٹی سے غلطی اسے لے بیٹھی تھی۔

ویسے نذیر خواجہ اپنی جگہ خوب شے تھے۔موصوف کے تین شوق تھے۔کرکٹ' شاعری' خاکساریت۔دفتر میں کبھی بلے کے ساتھ نمودار ہوتے' کبھی بیلچے کے ساتھ۔''امروز'' کے خاص نمبروں کے لیے بڑے ذوق وشوق سے نظم لکھتے۔مگر ہر نظم حسرت صاحب کے کاغذات کے بیچ دفن ہو جاتی۔''امروز'' کے صفحات تک پہنچتے پہنچتے رہ جاتی۔حسرت صاحب نے ایک مرتبہ ان کا ذوق وشوق دیکھ کر کہا کہ''امروز'' کے صفحات تو پر ہو گئے۔بہتر یہ ہے کہ اسے نیوز روم کے دروازے پر آویزاں کر دیا جائے تا کہ آنے والے صاحب ذوق لوگ اسے پڑھیں اور سر دھنیں۔سو ایسا ہی کیا گیا۔کئی دن تک وہ نظم نیوز روم کے دروازے پر آویزاں رہی اور آنے جانے والوں کو پڑھنے کی دعوت دیتی رہی۔

خبروں کا ترجمہ کرتے ہوئے اکثر و بیشتر کوئی ایسا گل کھلاتے تھے کہ فوراً پکڑے جاتے تھے۔نظام حیدر آباد کے متعلق کوئی خبر

آئی۔انہوں نے خبر کا ترجمہ کرتے ہوئے نظام حیدرآباد کو حیدرآباد کا راج پرمکھ لکھا۔حسرت صاحب نے باز پرس کی ''مولانا آپ نے نظام حیدرآباد کو حیدرآباد کا راج پرمکھ کس خوشی میں لکھا ہے۔''

جواب دیا ''مولانا' میں نے یہ طنزیہ لکھا ہے۔''

''تو پھر مولانا' حسرت صاحب نے کش لیتے ہوئے کہا ''بریکٹ میں لکھ دیا ہوتا کہ یہ طنز ہے۔''

اس دفتر میں حسرت صاحب کا جو سب سے چہیتا تھا وہ احمد بشیر تھا۔اسی لیے سب سے زیادہ عتاب اسی پہ نازل ہوتا تھا۔جب اس کا فیچر چھپتا تو اس کی کمبختی آ جاتی۔لمبی پیشی ہوتی۔حسرت صاحب فیچر میں اتنی غلطیاں نکالتے اور اتنے عیب گناتے کہ احمد بشیر کی طبیعت صاف ہوجاتی۔کمرے سے روہانسا ہو کر نکلتا۔پر نیوز روم میں بیٹھ کر حسرت صاحب کو گالیاں دیتی شروع کرتا۔''بڈھے کو دیکھو ویسے نشان لگا لگا کر فیچر کو کالا کر دیتا ہے۔مگر جب لوگ فیچر کی تعریف کرتے ہیں تو کہتا ہے کہ مولانا یہ میں نے ڈکٹیٹ کرایا تھا۔'' مگر ادھر چار ساڑھے چار بجے اور رمضان نے آ کر کہا کہ صاحب یاد کر رہے ہیں۔بس احمد بشیر کے تن بدن میں نئی زندگی دوڑ جاتی۔اپنے کاغذ سمیٹ' بغل میں داب' تیر کی طرح نیوز روم سے نکلتا۔پھر حسرت صاحب اسے لے کر دفتر سے نکل جاتے۔باہر ان کا تانگہ تیار کھڑا ہوتا۔

دوسرے دن آ کر احمد بشیر بتاتا کہ رات کس بالا خانے پر جا کر کس کا گانا سنا تھا اور کیا نوش جاں کیا تھا۔مگر اسی ہنگام طلبی ہوجاتی اور محفل شب کا سارا لطف غارت ہوجاتا۔

مگر میرا جس رفیق کار سے زیادہ پختہ یارانہ قائم ہوا۔وہ اور ہی رنگ کا نگینہ تھا۔حمید ہاشمی۔سچا اور پکا کامریڈ' پارٹی ممبر ''امروز'' میں پارٹی کے مفادات کا نگہبان۔میاں افتخار الدین کا خاص الخاص۔عجب اور اجنبی لوگ اس سے ملنے آتے اور بالعموم رات بارہ بجے کے بعد۔نہ مجھے کبھی تجسس ہوا کہ یہ کون لوگ ہیں اور نہ اس نے کسی کے متعلق بتایا سوائے ایک کے۔رات کی شفٹ۔کوئی بارہ بجے کا عمل ہوگا۔ایک صاحب سوٹ بوٹ میں ملبوس۔سر پہ ہیٹ۔آنکھوں پر کالی عینک۔خاموشی سے آ کر حمید ہاشمی کے قریب کرسی سرکا کر بیٹھ گئے۔مگر ہونٹ جیسے سلے ہوں۔آدھ پون گھنٹہ بیٹھے رہے۔سامنے چائے کی پیالی رکھی ہے۔ساتھ ہی پائپ سے شغل ہو رہا ہے۔پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔حمید ہاشمی بھی ساتھ ہی نکل گیا۔گھنٹہ بھر بعد واپس آیا۔کاپی کو دیر ہو رہی تھی۔فوراً اس پر جت گیا۔جب کاتب ادھر ادھر ہوئے تو بولا ''پہچانا یہ کون صاحب تھے۔''

''نہیں۔کون صاحب تھے۔''

''سبط بھائی۔''

''سبط حسن۔ اچھا۔ مجھ سے تعارف کیوں نہیں کرایا۔''

''پاگل ہوئے ہو۔ وہ تو ان دنوں انڈر گراؤنڈ ہیں۔''

یہ تھی سبط حسن سے میری پہلی شناسائی' اگر اسے شناسائی کہا جا سکتا ہے تو۔

حمید ہاشمی' انیس ہاشمی دونوں ہی بھائی خوب تھے۔ مفتی ہند مولانا سعید احمد دہلوی کے بھتیجے۔ تائے نے کیا قسمت پائی۔ خود مفتی ہند عالم دین۔ بھتیجے دونوں نخالص کمیونسٹ۔ دونوں پروگریسو پیپرز سے وابستہ جس کے زیر اہتمام ''پاکستان ٹائمز'' اور ''امروز'' نکلتے تھے۔

''امروز'' نے اپنا ابتدائی زمانہ نسبت روڈ کے اس گوشے میں گزارا جو میکلوڈ روڈ سے متصل تھا۔ اور میکلوڈ روڈ اس زمانے میں ریڈ سکوئر کا مقام رکھتا تھا۔ ریڈ لائٹ ایریا کی اصطلاح بدنام نہ ہوگئی ہوتی تو میں اسے ریڈ لائٹ ایریا کہتا۔ یاروں نے ترقی پسند ادیبوں اور اشتراکی دانشوروں یا بائیں بازو والوں کے لیے ایک مشترکہ نام رکھ چھوڑا تھا۔ سرخا۔ تو اس کوچے میں صبح و شام وقت بے وقت رنگ رنگ کے سرخے اہلے گہلے پھرتے نظر آتے تھے۔ یہاں کے چائے خانے کچھ فلمی مخلوق کے دم سے کچھ اس مخلوق کے دم سے آباد تھے۔ چار قدم کے فاصلے پر دیال سنگھ لائبریری تھی جہاں ترقی پسند مصنفین کی ہفتہ وار مجلسیں ہوتی تھیں۔ اور ''امروز'' تو سمجھو کہ اس کوچے کے بیچ تھا۔ چائے خانے میں بیٹھے بیٹھے جی گھبرایا تو ''امروز'' کے دفتر میں آن براجے۔ لیجئے منہ کا ذائقہ بدل گیا۔

''امروز'' کی اشاعت محدود تھی۔ مگر اس کی ساکھ بہت تھی۔ اس کے دم سے اردو صحافت کا اعتبار قائم ہو چلا تھا۔ اس کے ادبی اڈیشن نے بھی خوب شہرت پکڑی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ نظم و نثر کے ذیل میں آج کے دستور کے مطابق جو اچھا برا میسر آیا چھپ گیا۔ حسرت صاحب براہ راست اس میں دلچسپی لیتے اور ٹھوک بجا کر تحریر کو دیکھتے تھے۔ اخبار ترقی پسند تھا۔ ان کا طور رجعت پسندانہ تھا۔ زبان کی صحت پہ بہت زور تھا۔ ہمعصر ادب کہ خواہ ترقی پسند ہو خواہ رجعت پسند خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ کلاسیکی ادب کے متوالے تھے۔ بہرحال ایک ترقی پسند اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ سو جب تاثیر صاحب نے روزنامہ مغربی پاکستان میں ترقی پسندوں کے خلاف محاذ قائم کیا اور اس تقریب سے ''امروز'' کو بھی رگیدنا شروع کیا تو حسرت صاحب نے بقدر ضرورت اپنے قلم کی نوک پر سرخی لگا کر ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ بس یوں سمجھو کہ جواب میں.....

''امروز'' میں بھی ایک مورچہ قائم ہوگیا۔ لیجئے دونوں طرف سے توپیں دغنے لگیں۔ یہ منظوم معرکہ آرائی تھی۔ ایک نظم یا ہجو ''مغربی پاکستان'' میں تو دوسرے دن جوابی نظم ''امروز'' میں۔ امروز کے عملہ میں بھی ایک شاعر تھا جس نے اخبار کی اس جنگی ضرورت

کو پورا کیا۔ یہ شعیب حزیں تھے۔ مگر حسرت صاحب نے باہر سے بھی ترقی پسند شاعروں کی کمک منگوالی تھی۔ انہوں نے جان توڑ کے اس جہاد میں حصہ لیا اور جوش جہاد سے سرشار ہو کر نظمیں لکھیں۔ مگر تاثیر صاحب جو ایک شعر روانی میں لکھ گئے تھے اس کا جواب نہیں آیا۔ وہ شعر یہ تھا۔

عجیب بات وہ جنتا کا یار کہتا ہے
کہ شعر وہ ہے جو فتو لوہار کہتا ہے

لڑائی میں بڑھتے بڑھتے یہ نوبت آئی کہ حسب نسب بھی یاروں نے بکھان ڈالے۔ حسرت صاحب کے کالم نے جب یہ رنگ پکڑا تو مولانا عبدالمجید سالک فکرمند ہو کر گھر سے نکلے اور چھڑی ٹیکتے ''امروز'' کے دفتر میں آن دھمکے۔ دن بھر بیٹھے رہے اور فریقین میں صلح کرانے کی کوشش کرتے رہے۔ لیجئے شام تک سیز فائر ہو گیا۔ اگلے دن ''مغربی پاکستان'' اور ''امروز'' کے صفحات نظموں اور کالموں سے خالی تھے۔

اس وقت تک ترقی پسند بہت زوروں میں تھے۔ اور یہ ایسا زمانہ تھا جب ترقی پسند ہی نہیں پاکستان میں خالص کمیونسٹ بھی دیکھنے کو مل جاتے تھے۔ ایک ایسی شخصیت ''امروز'' کے دفتر کے آس پاس ہی دکھائی دیتی تھی۔ یہ تھے دادا منصور و دوسرے تو مارکسیت پر بحثیں کرتے تھے۔ یہ شخص اپنی قلندرانہ روش کے ساتھ خاموش اپنی دھن میں گم میکلوڈ روڈ پر گھومتا پھرتا دکھائی دیتا تھا۔ حمید ہاشمی کا گھر اس کا ٹھکانا تھا۔

مگر یہ بہار چند روزہ تھی۔ جلد ہی ایسا از غیبی گولہ پھٹا کہ پھر نہ جنوں رہا نہ پری رہی۔ ایک دن صبح ہی صبح اخبار کھولا تو لیڈ کی خبر وہ تھی جو پنڈی سازش کے نام سے مشہور ہوئی۔ اور میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ خبر پڑھی کہ جرنیلوں کے ساتھ فیض صاحب بھی اس قصے میں پکڑے گئے ہیں۔

جب دفتر پہنچا تو پورے دفتر پہ ایک خوف و ہراس طاری تھا۔ اس ریلے میں جو گرفتاریاں ہوئی تھیں ان میں ''امروز'' کے ہمارے کچھ ساتھی بھی شامل تھے۔ حمید ہاشمی کو تو جانا ہی تھا۔ ظہیر بابر بھی دھر لیے گئے۔ دفتر میں کھلبلی مچ گئی۔ ایک رفیق کار نے مجھے الگ کونے میں لے جا کر رازدارانہ پوچھا ''گھر میں روسی کتابیں تو نہیں ہیں۔''

''ہاں ہیں۔ کیوں' کیا بات ہے۔''

''استاد فوراً گھر جاؤ۔ ان کتابوں کو دفع کرو۔''

''آخر وجہ؟''

''خبر یہ ملی ہے کہ ''امروز اور پاکستان ٹائمز'' میں کام کرنے والوں کے گھروں پر چھاپے مارے جائیں گے جس کے گھر سے روسی لٹریچر برآمد ہو گیا بس سمجھو اس کی شامت آ گئی۔ تو پیارے گھر میں کوئی روسی کتاب ہے تو اسے دفع کرو۔''

میں چکنم میں پڑ گیا۔ سوچ رہا تھا کہ چیخوف اور تورگنیف کو کیسے دفع کروں اور کہاں دفع کروں۔

مگر اس واقعہ کے بعد ''امروز'' میں ہماری عمر بھی تھوڑی ہی رہ گئی۔ آگے انتظامیہ اور حسرت صاحب کے بیچ کوئی جھگڑا ہوتا تھا تو فیض صاحب بیچ میں پڑ کر صلح صفائی کرایا کرتے تھے۔ اب وہ تو تھے نہیں۔ ادھر سٹاف کو انتظامیہ سے کچھ شکایات پیدا ہوئیں۔ حسرت صاحب انتظامیہ سے بھڑ گئے۔ اور ایسے بھڑے کہ ان کے ساتھ ہم سب کے استعفوں کی نوبت آ گئی۔

ہم جب اجتماعی استعفادے کر دفتر سے نکلنے لگے تو کیا دیکھتے ہیں کہ گیٹ کے سامنے خاکساروں کا ایک دستہ قطار بنائے کھڑا ہے۔ ادھر ہم نے گیٹ سے باہر قدم رکھا ادھر وہ مستعد ہو کر چپ وراست کرنے لگے۔ ہم نے آنکھیں مل کر حیرت سے دیکھا یہ کیا یعنی چہ۔ خواجہ نذیر کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے فخر سے ہمیں بتایا کہ خاکسار تم لوگوں کو سلامی دینے آئے ہیں۔ اچھا تو یہ اپنے خواجہ کی کارستانی ہے۔ سبحان اللہ ہم نے ''امروز'' سے استعفادے کر فلک پر کونسا تیر مارا ہے کہ خاکساروں کی سلامی کے مستحق بن گئے۔ سلامی لی تو پھر اظہار تشکر کے طور پر چھوٹی سی تقریر بھی لازم آئی۔ جب دوسرا کوئی ساتھی اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے تیار نہ ہوا تو خواجہ نے مجھے دھکیل کر آگے کر دیا۔ تو لیجئے ہم نے خاکساروں سے خطاب کیا اور پھر گھروں کو رخصت ہوئے۔

حسرت صاحب ہم سب ''امروز'' سے نکلے ہوؤں کو اس طرح ساتھ لیے شہر میں پھرتے رہے جیسے مرغی اپنے بچوں کو لے کر دانے دنکے کی تلاش میں گھورے کریدتی پھرتی ہے۔ مٹی ذرا نم دیکھی اور پنجوں سے چونچ سے کریدنا شروع کر دیا۔ بچے ارد گرد کس آس کے ساتھ اکٹھے ہو جاتے ہیں جیسے اس کوڑے کی تہہ سے اتنا کچھ نکلے گا کہ وہ نہال ہو جائیں گے۔ جب کچھ برآمد نہیں ہوتا تو مرغی پر جھاڑ کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ بچے آئندہ کے لیے امید باندھ کر چوں چوں کرتے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ یہ گھورا نہ سہی اگلا گھورا سہی۔ ملک خدا تنگ نیست۔ کتنے سرمایہ داروں' صنعت کاروں' ناشروں کے در پہ دستک دی۔ ایک نیا اخبار نکالنے کا جو منصوبہ بنایا تھا سب کے سامنے پیش کیا۔ سب نے ہمت کی داد دی' مالی تعاون کا یقین دلایا۔

حسرت صاحب ''امروز'' سے نکلتے وقت بہت زوروں میں تھے۔ کتنے ہی دن زوروں میں رہے۔ انہیں دنوں وزارت اطلاعات کے تحت کراچی ریڈیو میں ایک رائٹرز یونٹ قائم ہوا تھا۔ حسرت صاحب کو وہاں سے بلاوے پہ بلاوہ آ رہا تھا۔ ادھر حسرت

صاحب پہ نئے اخبار کا سودا سوار تھا۔ مگر رفتہ رفتہ انہیں احساس ہوا کہ سب زبانی جمع خرچ ہے۔ وعدے صرف وعدے ہیں۔ ان تلوں میں تیل نہیں ہے۔

بس اسی ہنگام حمید ہاشمی اور ظہیر بابر رہا ہو کر نکل آئے۔ حمید ہاشمی جیل سے نکلتے ہی اپنے مشن پر نکل کھڑا ہوا۔ ہماری اس سے ایک خفیہ ملاقات ہوئی۔ یعنی میری اور امجد حسین کی۔ حمید ہاشمی نے سمجھایا پگلو یہ تو ''امروز'' کے خلاف سرکاری سازش تھی۔ تم لوگ بھولے بادشاہ۔ بھرے میں آ کر نکل کھڑے ہوئے۔ خیر تم دونوں کے متعلق میں نے میاں صاحب سے بات کر لی ہے۔ تو بس تم واپس آ جاؤ۔

میں نے امجد کی طرف اور امجد نے میری طرف دیکھا۔ میں نے رکتے رکتے پوچھا ''اور حسرت صاحب.....''

''حسرت صاحب کو بھول جاؤ۔''

مگر حسرت صاحب کو ہم دونوں بھولنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اس پہ بات ختم ہو گئی۔ نہیں ختم نہیں ملتوی ہوئی۔ پھر ہمارے دوسرے ساتھیوں کو ٹوہا گیا۔ مگر کھیل ایک دفعہ بگڑ جائے پھر کہاں سنورتا ہے۔

ہاں تو حسرت صاحب کو آخر پتہ چل گیا کہ لاہور شہر اس اس بھلے زمانے کو فراموش کر چکا تھا۔ جب نامور اخبار نویس اپنی ساکھ پہ تکیہ کر کے صاحب دلوں سے اپیل کرتے تھے۔ اور چندے کی بارش ہونے لگتی تھی۔ سو اب حسرت صاحب نے کراچی سے آنے والے پیغام پر کان دھرا۔ لاہور کو سلام کیا اور کراچی کی طرف نکل گئے۔ ساتھ میں احمد بشیر کو بھی لے گئے۔ رہ گئے ہم باقی یار' تو لشٹم پشٹم سب ہی ہلہ سے لگ گئے۔ میں اکیلا بھٹکتا رہ گیا۔ ایک دوپہر مال روڈ پہ بھٹکتے بھٹکتے مجھے خیال آیا کہ کتنے دنوں سے میں نے ٹی ہاؤس میں نہیں جھانکا۔ ''امروز'' کے یاروں سے ساتھ چھوٹ گیا تو ادھر چل کر دیکھیں شاید کوئی ادیب برادری کا یار مل جائے۔ چائے کی پیالی پر چار گھڑی اسی سے سنگت سہی۔ ٹی ہاؤس میں داخل ہوا تو ایک میز پر نظر گئی جہاں ناصر کاظمی تھا اور ایک منحنی سی شے جسے میں نے اب سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ یہ تھا شہرت بخاری۔ اچھی صحبت رہی۔ ناصر سے اب سے پہلے جب بھی ملاقات ہوئی کافی ہاؤس میں ہوئی جہاں وہ ریاض قادر کے ساتھ بیٹھا نظر آتا تھا۔ ٹی ہاؤس میں یہ پہلی ملاقات تھی۔ جب میں وہاں سے اٹھا تو مجھے بالکل احساس نہیں تھا کہ میں آج پکڑا گیا ہوں۔ اب اس صحبت سے چھٹکارا نہیں ہے۔

مگر حسرت صاحب کا ذکر تو پورا ہو لینے دیجئے۔ حسرت صاحب لاہور سے نکل کر کس کس دیار گئے تھے۔ کلکتہ ملایا' سنگاپور و ہر پھر لاہور و کراچی خیر کونسا ایسا دور تھا کہ وہاں سے واپس آنا مشکل ہوتا۔ رائٹر زیونٹ نے بھی کوئی ایسی زیادہ عمر نہیں پائی۔ ادھر اس کے دن پورے ہوئے' ادھر لاہور نے حسرت صاحب کو پکارا۔

اب ان کا پرانا ٹھکانا عرب ہوٹل بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ نیا زمانہ تھا۔ نیا ٹھکانا۔ روز دن ڈھلے ایک تانگہ میکلوڈ روڈ کی طرف سے آتا دکھائی دیتا۔ کافی ہاؤس کے سامنے آ کر رکتا۔ حسرت صاحب اب ہاتھ میں چھڑی رکھنے لگے تھے۔ چھڑی ٹیکتے تانگہ سے اترتے اور کافی ہاؤس میں داخل ہو جاتے۔ ایک شام کافی کا آرڈر دیا۔ مگر بیرا آرڈر لے کر ایسا غائب ہوا کہ دیر تک صورت نہ دکھائی۔ پرانا بیرا منشی قریب سے گزرا تو اس سے شکایت کی کہ آرڈر دیئے کتنی دیر ہو گئی۔ کافی نہیں آئی۔

منشی نے پوچھا' کس بیرے کو آرڈر دیا تھا۔ پھر سوچ کر بولا'' وہ تو نہیں جس کے سر کے سارے بال سفید ہیں۔''

حسرت صاحب نے سگریٹ کا کش لیا اور بولے'' مولانا' جب وہ آرڈر لے کر گیا تھا اس وقت تو اس کے سر کے سارے بال کالے تھے۔''

حسرت صاحب اب'' نوائے وقت'' میں کالم لکھ رہے تھے۔ اور کس پابندی سے کالم لکھا کہ آخری دن کالم پہلے لکھا' دنیا سے کوچ بعد میں کیا۔ اگلی صبح اخبار میں انتقال کی خبر اور کالم ساتھ ساتھ چھپے۔ دوستوں اور نیاز مندوں نے پہلے ان کا کالم پڑھا' پھر جا کر انہیں کاندھا دیا۔

◆◆◆

کافی ہاؤس سے ٹی ہاؤس تک

انجمن ترقی پسند مصنفین برباد، میکلوڈ روڈ ویران، فیض صاحب ہنوز جیل میں ہیں۔ وہ پنڈی سازش کیس کے بڑے ملزموں میں شامل کیے گئے ہیں۔ جو ادیب اس ریلے میں پکڑے گئے تھے وہ چھوٹ تو گئے ہیں مگر خاموش ہیں۔ جن ادیبوں نے ترقی پسند نظریے کے خلاف علم بلند کیا تھا ان کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ ڈاکٹر تاثیر دنیا سے کوچ کر گئے۔ عسکری صاحب نے کراچی کی راہ لی۔ پہلے والا جوش وخروش غائب ہے۔ اب انہیں ادب میں جمود نظر آتا ہے۔ ترقی پسند جو میدان میں نہیں ہیں کس سے لڑیں۔ پھر ادب میں جمود تو نظر آتا ہی تھا۔

"لذت عشق گئی غیر کے مرجانے سے"

اب پاک ٹی ہاؤس کا زمانہ شروع ہونے لگا ہے۔ اس زمانے کے رستے میں آنکھیں بچھاؤ۔ اس کے جلو میں نئے لکھنے والے رنگ رنگ کے قطار اندر قطار آئیں گے۔ سو یہ ٹھکانا ادب کے باقی سب ٹھکانوں سے خواہ اس شہر میں ہوں یا اس شہر سے باہر کراچی میں ہوں یا پنڈی میں ہوں زیادہ عمر پائے گا۔ عرب ہوٹل' نگینہ بیکری' کافی ہاؤس' چائنیز لنچ ہوم' یہ تو سب بس تھوڑی تھوڑی بہار دکھائیں گے۔

کسی چائے خانے کا ادیبوں کا اڈا بننے کے لیے شاید یہ ایک شرط ہے کہ اسے کسی تعلیمی مرکز کے قریب واقع ہونا چاہیے۔ لاہور میں عرب ہوٹل کے وقتوں سے یہی ریت چلی آتی ہے۔ عرب ہوٹل ریلوے روڈ پر عین اسلامیہ کالج کے سامنے واقع ہے۔ تقسیم سے پہلے تو یہی کوچہ سب سے بڑھ کر شہر کے مسلمانوں کی تعلیمی' تہذیبی اور سیاسی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ یہ جائے وقوع عرب ہوٹل کو لے اڑی۔ مولانا چراغ حسن حسرت' ڈاکٹر تاثیر' اختر شیرانی' کیسی کیسی ادبی شخصیت یہاں بیٹھ کر ہنگامہ آراء ہوئی۔ قریب ہی وہ تنبولن بہت ٹھسے سے بیٹھی تھی جیسے ناصر کاظمی کی روایت کے مطابق اختر شیرانی نے قلوپطرہ کا خطاب دیا تھا۔ قلوپطرہ خیر سے ذوق شعر بھی رکھتی تھی۔ اختر شیرانی سے پہلے شعر سنتی۔ پھر گلوری بنا کر چاؤ سے پیش کرتی۔

پاکستان بننے کے بعد یہ پورا کوچہ ہی پس منظر میں چلا گیا۔ اب علماء فضلاء ادباء کا مرجع پنجاب یونیورسٹی تھی۔ چار قدم پر پرانی انارکلی میں نگینہ بیکری تھی۔ بخت نے اس کی یاوری کی۔ علما فضلا نے اسے اپنا اڈا بنالیا۔ مگر اس سے آگے تھوڑے فاصلہ پر انڈیا کافی

ہاؤس تھا۔ کشش اس طرف زیادہ تھی۔ سوگلینہ بیکری تو بس چند بزرگ پروفیسروں ہی کا دل جیت سکی۔ ساری نئی دانش کو کافی ہاؤس نے لپک لیا۔ نئے مصوروں نے خاص طور پر اسے اپنا اڈا بنایا۔ سیاست کا چسکا رکھنے والے لوگ' نوجوان پروفیسر' صحافی' نئے دانشور' باری باری سب نے آ کر یہاں ڈیرا کیا۔ شاکر علی جب اس شہر میں وارد ہوئے تو پہلے پہل یہیں آ کر براجے۔ یہیں پاکستان کی تجریدی مصوری نے آنکھ کھولی۔

ریاض قادر دان کے ساتھ ناصر کاظمی۔ جب وہاں جھانکو یہ دونوں موجود۔ ریاض قادر کی چڑ دو چیزیں تھیں۔ ایک ان کا گنجا سر' دوسرے ان کے والد گرامی سر شیخ عبدالقادر جس نے ان دو میں سے ایک کی طرف ہلکا سا بھی اشارہ کر دیا اس کی کمبختی آ گئی۔ یعنی کسی کو یہ اجازت نہیں تھی کہ وہ ان کا تعارف سر شیخ عبدالقادر کا نور نظر بنا کر کرائے۔ باقی گنج کا معاملہ یہ تھا کہ گورے چٹے آدمی تھے۔ مگر گورے چہرے سے زیادہ ان کی صفاچٹ چاند چمکتی تھی۔ بس انہیں شک ہو جائے کہ کسی نے ان کے سر کی طرف دیکھا ہے' پھر اس کی خیر نہیں تھی۔ ہمہ وان قسم کے دانشور تھے۔ جو موضوع زد میں آ گیا اس پر رواں ہو گئے۔ بس پھر وہی بولتے تھے۔ دوسرے صرف سنتے تھے۔ دوسرا کوئی نہ بیچ میں بول سکتا تھا نہ بیچ میں سے اٹھ کر جا سکتا تھا۔ بے شک پورا پہر گزر جائے۔ کوئی کسمسا کر اٹھنے کی کوشش کرتا تو برہمی سے کہتے کہ صاحب فقرہ تو پورا ہو لینے دیجئے۔ مگر دقت تو یہی تھی کہ ان کا فقرہ کبھی پورا ہوتے نہیں دیکھا گیا۔

کافی ہاؤس آنے جانے والوں میں ایک نگ لکھنو کا بھی تھا۔ وہ پہلے ناصر کاظمی کے مداح بنے۔ اس کے واسطے سے ریاض قادر سے شناسائی ہوئی۔ دفتر قریب ہی تھا۔ لنچ کے اوقات میں کافی ہاؤس آتے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ناصر اور ریاض قادر کی صحبت کا لطف اٹھایا اور واپس اپنے دفتر ت ایک بار یوں ہوا کہ وہ آئے تو اکیلے ریاض قادر بیٹھے تھے۔ ایک سامع میسر آیا تو وہ رواں ہو گئے اور ایسے رواں ہوئے کہ لنچ کا دفتری وقفہ گزر گیا اور وہ نہ تھے۔ یہ صاحب ایک تو لکھنو کی وضعداری کے مارے ہوئے۔ پھر ریاض قادر کا رعب۔ اور فقرہ تھا کہ پورا ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ ایک بجے وہ یہاں آئے تھے۔ اب ساڑھے تین بج رہے تھے۔ اتنے میں ناصر کا ورود ہوا۔ لکھنوی دوست نے ناصر کو دیکھ کر ضبط کا دامن چھوڑا۔ کھڑے ہوتے ہوئے روہانسی آواز میں بولے ''ناصر صاحب' ہمارا دفتر کا وقت ختم ہو رہا ہے۔ اور ادھر قبلہ کا فقرہ مکمل نہیں ہو پا رہا۔''

کافی ہاؤس ہی کے ایک گوشے میں ناطق صاحب بیٹھے نظر آتے تھے

ناطق کہ سخن تیرا ہے تریاق تریہا
زمباق تریہالک بمباق تریہا

نواب ناطق نے اپنا شجرہ نسب یوں بتایا تھا کہ وہ غالب کے بھائی کی پڑپوتی کی بیٹی کے نور نظر ہیں۔ کافی ہاؤس میں ڈیرا چلا آ رہا